شریعت، طریقت اور اجتماعیت پر مبنی دینی شعور کا نقیب

ماہنامہ رحیمیہ لاہور

بانی: حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری
قدس اللّٰہ سِرَّہٗ السّعید مسند نشین رابع خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور

مدیر اعلیٰ: حضرت اقدس مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری
جانشین حضرت اقدس رائے پوری رابع

ستمبر 2020ء / محرم الحرام ۱۴۴۲ھ جلد نمبر 12، شمارہ نمبر 9 - قیمت: 20 روپے سالانہ ممبر شپ: 200 روپے تین سالہ ممبر شپ: 500 روپے

مجلس ادارت

سرپرست: ڈاکٹر مفتی سعید الرحمن
صدر: مفتی عبدالمتین نعمانی
مدیر: محمد عباس شاد

ارشادِ گرامی

حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ
مسند نشین ثانی
خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور

دریافت کیا گیا کہ: حضرت! جو (صحیح بخاری کی) حدیث میں آیا کہ: ''بندہ اگر اللہ کی طرف ایک ہاتھ چلتا ہے تو اللہ اس کی طرف ایک ذراع (یعنی گز بھر) چلتا ہے۔ (اسی طرح) بندہ چل کر اس کی طرف جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوڑ کر آتا ہے۔'' یہ جانا آنا، کیا (مطلب رکھتا) ہے؟

(حضرت والاؒ نے) فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ کی طرف خیال (مکمل دھیان) سے چلنا (مراد) ہے۔'' عرض کیا گیا کہ: (کیا اس کا مقصد) عمل سے (چلنا ہے)؟

(حضرت والاؒ نے) فرمایا: ''عملِ بے نیت، صالح (قابلِ قبول) نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ بھی (اللہ تعالیٰ کی طرف) خیال (رکھنے اور توجہ) کے ساتھ ہی (قبول) ہوتا ہے۔ کوئی آدمی آٹھ پہر میں ایک دفعہ بھی اللہ کا خیال کرے تو یہ چلنا ہوا۔ جو زیادہ (توجہ) کرتا ہے، وہ دوڑ کر چلتا ہے اور جو ہر وقت (اللہ کا) خیال رکھے، وہ بہت تیز دوڑتا ہے اور اللہ (بندے کی اس توجہ کو) قبول کرے اور توجہ کرے تو یہ ''اللہ کا آنا'' (کہلاتا) ہے۔ اس راستے کی کوئی حد نہیں۔ جو (لوگ) زیادہ اللہ کا خیال رکھتے ہیں، وہ (اس کا) زیادہ قرب حاصل کر لیتے ہیں۔''

(یکم رمضان المبارک ۱۳۷۰ھ/ 7 رجون 1951ء، بروز: جمعرات۔ مقام: رائے پور)
(ارشادات حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، ص 412، طبع: رحیمیہ مطبوعات، لاہور)

ترتیب مضامین

- حق چھپانے اور اس میں باطل کی ملاوٹ کی ممانعت
- محض گمان پر رائے قائم کرنے کی ممانعت
- حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ: رسول اللہ ﷺ کے رازدار
- حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کا طرزِ فکر اور عرب اسرائیل مسئلے کا پس منظر
- انسانی کامیابی اور ترقی کے چار بنیادی اَخلاق (2)
- دورِ بنواُمیہ میں دینی و دُنیوی علوم کی ترقی و ترویج
- معاشی خودمختاری کی حقیقت
- بدلتا ہوا عالمی سیاسی منظرنامہ (شمالی اوقیانوس سے بحرالکاہل کی طرف)
- صحیح علم اور معرفتِ الٰہی
- علم کی بنیاد پر فضیلت
- ٹھوس علم اور درست طریقۂ تعلیم
- حقیقی علم کے درست نتائج
- حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
- مشائخ رائے پور کے متوسل حاجی بابو عبدالمجید کا سانحۂ ارتحال
- لاک ڈاؤن کی تباہ کاریاں
- دینی مسائل

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور
0092-42-36307714,36369089-www.rahimia.org
Email: info@rahimia.org
رحیمیہ کا انگلش ایڈیشن ہماری ویب سائٹ پر پڑھا جا سکتا ہے۔

رقومات کی ترسیل بنام ''ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ ٹرسٹ لاہور'' اکاؤنٹ نمبر 0010030341820010 الائیڈ بینک مزنگ چونگی برانچ لاہور، برانچ کوڈ 0533

www.rahimia.org

درسِ قرآن

تفسیر: شیخ التفسیر مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

حق چھپانے اور اس میں باطل کی ملاوٹ کی ممانعت

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾
وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِينَ ﴿٤٣﴾

(اور مت ملاؤ صحیح میں غلط اور مت چھپاؤ حق کو جان بوجھ کر۔ اور قائم رکھو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ۔ اور جھکو نماز میں جھکنے والوں کے ساتھ۔) (2:43-42)

گزشتہ دو آیات سے بنی اسرائیل کی خرابیوں کا بیان جاری ہے۔ اُن سے کہا گیا ہے کہ: ''معاہدات کی پاسداری کرو، کتابِ مقدس قرآن حکیم پر ایمان لاؤ اور اللہ کی آیات کو معمولی معاوضے کے عوض مت بیچو۔'' ان آیاتِ مبارکہ میں ان کی مزید دو خرابیاں بیان کی جا رہی ہیں، جن سے بچنے کے لیے انھیں اصولِ دین قائم کرنے کا حکم دیا گیا۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ: حق و باطل میں فرق اور امتیاز دینِ حنیفی کی بنیادی خصوصیات میں سے ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمدِ مصطفیٰ ﷺ تک تمام انبیا علیہم السلام دنیا میں حق اور سچ کو غالب کرنے اور باطل کو مٹانے کے لیے آئے ہیں۔ حقائق کے خلاف تمام اُمور باطل کہلاتے ہیں اور تمام ادیانِ الٰہیہ میں حقائق پر مبنی بنیادی اساسی اُمور حق اور سچ ہیں۔ دینِ حق کا جھوٹ اور باطل پر غلبہ ضروری ہے۔ مسخ شدہ مذہبیت میں حق و باطل میں تلبیس اور ملاوٹ کی جاتی ہے۔ زوال کے زمانے میں مذہبی طبقہ ایسے ہی امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہودیوں کو بھی یہ مرض لاحق تھا کہ انھوں نے حق و باطل میں تلبیس پیدا کر دی تھی، اس سے انھیں روکا گیا ہے۔

حق و باطل کی تلبیس کی حقیقت یہ ہے کہ دینِ حنیفی دو بنیادی اُمور پر مشتمل ہے: (1) دین کے کچھ اُمور فرائض و واجبات کے طور پر ہیں، جو اصل مقصد ہیں۔ (2) کچھ اُمور اُن اصل اُمورِ مقصودہ تک پہنچنے کے ذرائع اور وسائل ہیں۔ تلبیس یہ ہے کہ دین کے ذرائع اور وسائل کو اصل مقصود بنا لیا جائے اور دین کے اصل مقاصد پسِ پُشت ڈال دیے جائیں۔ مثلاً سنن و مستحبات کو فرائض و واجبات کی طرح سمجھا جائے اور فرائض و واجبات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یا اسی طرح مستحب اور سنت کی اصل حقیقت اور نوعیت کو سمجھے بغیر انھیں بالکل بھلا دیا جائے۔ دین کے کسی فریضے اور حکم کو اس کی اصل حقیقت اور نوعیت سے گھٹا' یا بڑھا دینا اور شریعتِ حقہ میں کمی اور زیادتی کرنا تلبیس کہلاتا ہے۔ اس لیے قرآن حکیم نے تمام لوگوں کو حکم دیا ہے کہ حق و باطل میں تلبیس نہ کریں۔

وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ: دوسرا بڑا جرم یہ ہے کہ حق و باطل میں تلبیس کی بجائے سِرے سے حق ہی کو چھپا لیا جائے۔ یہ بھی بہت بڑا جرم ہے۔ زوال کے زمانے میں رجعت پسند مذہبیت اس مرض کا بھی شکار ہوتی ہے اور وہ دین کی سچی تعلیمات کو ذاتی اور گروہی مفادات کے لیے عام لوگوں سے چھپاتی ہے۔ یہودیوں میں بھی زوال کے زمانے میں یہ مرض لاحق ہو چکا تھا۔ اس لیے قرآن حکیم نے خاص طور پر بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے حق کو چھپانے سے باز رہنے کا حکم دیا ہے۔ حق کو چھپانا اتنا بڑا جرم ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس کی شدید مذمت کی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ: ''جس آدمی سے کسی ایسے علم کے بارے میں سوال کیا گیا، جسے وہ جانتا ہے، پھر اُس نے اُسے چھپایا تو قیامت کے دن اُس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔'' (مشکوٰۃ: 223) امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ: ''ضرورت کے وقت علمِ حق کو چھپانا حرام ہے۔ اس لیے کہ ایسا کرنا دین کی توہین ہے۔ یہ شریعت کو بھلا دینے کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح کرنے سے علم کا بڑا حصہ مٹ جاتا ہے۔'' (حجۃ اللہ البالغہ، من ابواب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

حقیقت یہ ہے کہ جب دین کے نااہل نمائندے دنیاوی لذات اور خواہشات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور دین کے غلبے کا اہتمام نہیں کرتے اور نہ اُس کی تعلیم دیتے ہیں اور نہ اس پر ٹھیک طرح سے عمل کرتے ہیں، نیکیوں اور معروفات کا نظام نہیں بناتے، منکرات سے نہیں روکتے تو آہستہ آہستہ دین کے خلاف رسومات اور نظام ہائے حیات قائم ہو جاتے ہیں۔ یہ سچے علم کو چھپانے اور اُسے پڑھنے پڑھانے سے رُک جانے کے نتائج ہوتے ہیں۔ اس لیے خاص طور پر حق و باطل کی تلبیس اور سِرے سے حق کو چھپانے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ اس کو بڑا جرم قرار دیا گیا ہے۔

وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾: جانتے بوجھتے ہوئے اور صحیح علم رکھتے ہوئے یہ دونوں جرائم کرنا بہت بڑی خرابی ہے۔ غلطی اور غفلت سے اس طرح کی کچھ کوتاہی ہو جائے تو اپنی غلطی اور غفلت کو دور کرنے سے اس کی تلافی ہو جاتی ہے، لیکن جانتے بوجھتے ہوئے ان جرائم کا اِرتکاب سخت عذاب کا سبب ہے۔ یہ دین مٹانے کے مترادف ہے۔

وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ: ان دو خرابیوں کے مقابلے میں دین کی اصل تعلیمات کے دو بنیادی اساسی اُصولوں کو بروئے عمل لانا ضروری ہے: (1) ایک نماز قائم کرنا اور (2) دوسرے انسانیت کی خدمت کے لیے زکوٰۃ ادا کرنا۔ نماز باجماعت کا قیام لوگوں کو حق و باطل کی تلبیس سے روکتا ہے۔ اس لیے کہ جب سب لوگ اجتماعی طور پر مسجد میں مقرر کردہ طریقۂ عبادت کے مطابق نماز ادا کریں گے تو دینِ حق میں کسی مخصوص طبقے کو تلبیس کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ فرائض و واجبات پورے مسلم اجتماع کو معلوم ہوں گے۔ نوافل اور مستحبات کی اصل حقیقت اور نوعیت بھی سب لوگوں کو معلوم ہوگی۔ نماز باجماعت کا اہتمام ہر طرح کی تحریف اور تلبیس سے دین کو محفوظ رکھتا ہے۔

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ: دین کا دوسرا اُصول زکوٰۃ ہے۔ یہ مالی بدعنوانی اور خواہشات سے روکتی ہے۔ عام طور پر مال کے لالچ میں آ کر حق بات چھپائی جاتی ہے۔ جب ارتفاقاتِ ضروریہ کے تحت کوئی انسان محتاجوں اور غریبوں پر مال خرچ کرتا ہے اور حق کو حق دار تک پہنچاتا ہے تو وہ کتمانِ حق جیسے جرم سے محفوظ رہتا ہے۔

وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِينَ: یہودیوں کو خاص طور پر رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس لیے کہ اُن کی شریعت میں رکوع کی عبادت نہیں تھی۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ دینِ اسلام قبول کر کے رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ ایسی اجتماعی عبادت کا اہتمام کرو کہ جو حق و باطل کی تلبیس اور حق کو چھپانے سے روکنے کا سبب بنتی ہے۔

درسِ حدیث

از: مولانا ڈاکٹر محمد ناصر، جھنگ

محض گمان پر رائے قائم کرنے کی ممانعت

عَنْ أَبِي قِلَابَةَ قَالَ: قَالَ أَبُو مَسْعُودٍ لِأَبِي عَبْدِاللّٰه، أَوْ قَالَ أَبُو عَبْدِاللّٰه لِأَبِي مَسْعُودٍ: مَا سَمِعْتَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ فِي زَعَمُوا؟ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ يَقُولُ: "بِئْسَ مَطِيَّةُ الرَّجُلِ: زَعَمُوا." (سنن ابی داؤد، 4972)

(حضرت ابوقلابہؒ سے روایت ہے کہ حضرت ابومسعودؓ نے ابوعبداللہؓ (حضرت حذیفہؓ) سے یا ابوعبداللہؓ (حذیفہؓ) نے حضرت ابومسعودؓ سے پوچھا کہ آپ نے اس بارے میں کیا سنا ہے جو لوگ ''زعموا'' (لوگوں کا خیال ہے، باور کیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے وغیرہ) کے انداز میں بات کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: ''زعموا'' آدمی کی بہت بُری سواری ہے۔'')

کسی بھی امر پر حتمی رائے قائم کرنے کے لیے قرآن و حدیث کی رہنمائی یہ ہے کہ رائے واضح ہو اور مستحکم دلیل پر مبنی ہو۔ مسلمان ایسا ذہن اور سوچ رکھے جو عقل و دانش پر مبنی ہو۔ مثبت، تعمیری اور نتیجہ خیز رائے کا مالک ہو۔ محض تخیلات اور توہمات پر مبنی مؤقف اپنانے کے بجائے کسی بھی مسئلے پر دستیاب معلومات کی روشنی میں صحیح فیصلہ کرنے کا خوگر ہو۔ مسلمان کو ایسی تربیت لینی چاہیے، جس سے اس کا ذہنی اُفق بلند ہو، جو اسے درست رائے قائم کرنے میں مددگار ہو۔ یہ رویہ اور رجحان کہ لوگ یہ کہتے ہیں، خیال (Perception) یہ ہے، میڈیا پر یہ بات چل رہی ہے، جیسی فضا سے متأثر ہو کر انسان رائے بنائے تو یہ رویہ نہایت گمراہ کن ہے۔ اگر انسان کی یہ عادت بن جائے تو یہ طرزِ عمل رسول اللہ ﷺ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ اس کے برعکس انسان کو دینی، سماجی اور اجتماعی امور کے حوالے سے ایسا صاف ذہن بنانے کی ضرورت ہے، جس میں وہ خود پختہ رائے قائم کرنے کی صلاحیت پیدا کر لے۔ اس کی تجزیاتی صلاحیت نکھر جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دستیاب علم تک رسائی، ٹھوس معلومات اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اہلِ علم و دانش کی صحبت اختیار کی جائے۔ ایسے ذی شعور لوگوں کی نگرانی میں اپنی ذہنی آبیاری اور تربیت کا اہتمام کیا جائے جو انسان کو درست رائے والا بنا دے۔

قرآن حکیم نے بے بنیاد اور ناپختہ سوچ رکھنے والوں کو کہیں **اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ** (78:2) (وہ محض گمان کرتے ہیں) کہا، کہیں **فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ** (171:2) (سو وہ کچھ نہیں سمجھتے) کہا اور کہیں ان کے بارے میں کہا **مَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ** (22:18) (یہ لوگ بہت کم جانتے ہیں)۔ قرآن حکیم کے یہ اشارات انھیں لوگوں کی طرف ہیں جو محض گمان اور اٹکل سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے مسلمان کو ممکنہ حد تک اپنے علم اور اپنی سوچ کو کامل اور پختہ بنانے کی ضرورت ہے۔ ورنہ ناپختہ سوچ انسان کو بے وقار، قوموں اور دینی جماعتوں میں بہت سے فسادات اور خرابیوں کا باعث بن جاتی ہے۔ افراد، جماعتیں اور قومیں پروپیگنڈے کا شکار ہو کر غلط راہوں پر چل نکلتی ہیں۔ یوں دنیا و آخرت کی ناکامی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

صحابہؓ کا ایمان افروز کردار

مولانا قاضی محمد یوسف، حسن ابدال

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ؛ رسول اللہ ﷺ کے رازدار

حضرت حذیفہ بن یمانؓ کو والدین کے مسلمان ہونے کی وجہ سے بالکل بچپن میں رسول اللہؐ کی زیارت اور دیدار سے قبل ہی ایمان کی انمول دولت نصیب ہو گئی تھی۔ آپؓ قدیم الاسلام ہیں، مگر بدر میں ابوجہل کے لشکر نے زبردستی کا وعدہ لکھوا لیا، جس وجہ سے شامل نہ ہو سکے۔ رسول اللہؐ کی زیارت اور دیدار کا شوق حضرت حذیفہؓ کے رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔ جب سے وہ مسلمان ہوئے تھے، رسول اللہؐ کے حالات جاننے کے لیے، نیز آپؐ کے اوصافِ حمیدہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی مسلسل کوشش اور جستجو میں لگے رہتے تھے۔ چناں چہ حضرت حذیفہؓ جب کچھ بڑے اور سمجھ دار ہو گئے تو ایک بار بہ طورِ خاص رسول اللہؐ سے ملاقات کی غرض سے مدینہ سے سفر کرتے ہوئے مکہ پہنچے، جہاں انھیں زندگی میں پہلی بار آپؐ کا دیدار نصیب ہوا۔ اس کے بعد جب رسول اللہؐ ہجرت فرما کر مکہ سے مدینہ تشریف لائے تو ایک روز حضرت حذیفہؓ نے آپؐ سے دریافت کیا کہ: ''اے اللہ کے رسول! کیا میں مہاجرین میں سے ہوں یا اَنصار میں سے؟'' اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''اگر تم چاہو تو خود کو مہاجرین میں شمار کر لو اور اگر چاہو تو اَنصار میں سے''۔ اس پر حضرت حذیفہؓ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں اَنصاری ہوں''۔

رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے بعد حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد یمانؓ دونوں کی یہی کیفیت رہی کہ ہمہ وقت زیادہ سے زیادہ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضری اور علمی استفادے میں مشغول و منہمک رہا کرتے تھے۔ ہجرتِ مدینہ کے فوری بعد محض اگلے ہی سال جب مشرکین و مخالفین کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف جنگوں کا دور شروع ہوا تو آپؓ بدر کے سوا سب معرکوں میں شریک رہے۔ حضورؐ نے حضرت عمار بن یاسرؓ اور آپؓ کے درمیان عقدِ مواخات (بھائی چارے کا معاہدہ) کرایا۔

حضرت حذیفہؓ سو سے زیادہ احادیث کے راوی ہیں۔ 12 صحیح بخاری و مسلم دونوں میں موجود ہیں اور آٹھ احادیث صحیح بخاری میں ہیں۔ 17 صرف مسلم شریف میں ہیں۔ عہدِ رسالت میں ریاستی سطح کے اہم امور میں بھی شریک رہے۔ مدینہ میں مسلمانوں کی پہلی مردم شماری کی ڈیوٹی آپؐ نے حضرت حذیفہؓ ہی کی لگائی۔ اس وقت مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد پندرہ سو تھی۔ ایک شخص نے آپؓ سے پوچھا کہ فتنوں میں سے بڑا فتنہ کون سا ہوگا؟ تو آپؓ نے فرمایا: ''اچھائی اور برائی دونوں تمھارے سامنے ہوں، لیکن تمھیں یہ پتہ نہ ہو کہ ہم کس کو اختیار کریں۔'' حضرت عمرؓ نے حضرت حذیفہؓ کو مدائن کا گورنر بنا کر بھیجا تو آپؓ نہایت سادگی سے اپنے گدھے پر سوار ہو کر گئے۔ ایک بار حضرت عمرؓ نے آپؓ کو مدینہ بلایا اور جنگل میں چھپ کر دیکھا کہ کتنا مال واپس ساتھ لاتے ہیں؟ دیکھا کہ تن تنہا سواری پر خالی ہاتھ آ رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ آگے بڑھے اور فرمایا: ''تُو میرا بھائی اور میں تمھارا بھائی''۔ آپؓ کا انتقال ۳۶ھ/ 656ء میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کے 40 روز بعد ہوا۔ اس وقت آپؓ مدائن دبا کے علاقے میں گورنر تھے۔ (طبقات ابن سعد)

شذرات

حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کا طرزِ فکر اور عرب اسرائیل مسئلے کا پسِ منظر

حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ خطۂ برعظیم پاک و ہند کی ایک باشعور دینی، سیاسی اور روحانی شخصیت تھے۔ ستمبر ان کے وصال کا مہینہ ہے۔ ان کا 26/ستمبر 2012ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ 33/A کوئینز روڈ لاہور پر ادارہ رحیمیہ سے متصل ''گلزارِ رحیمی'' میں مدفون ہیں۔

حضرت رائے پوریؒ ایک قومی دھارے کے بین الاقوامی صلاحیتوں کے حامل لیڈر تھے۔ ان کی نگاہ بڑی دور رس تھی۔ وہ اپنے سیاسی تدبر میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کے گراں قدر سیاسی و سماجی اَفکار ہماری علمی و فکری تاریخ کا قابلِ قدر قیمتی اَثاثہ ہیں۔ حالاتِ حاضرہ کے سیاسی و اقتصادی مسائل میں درست زاویۂ نگاہ ان کی شخصیت کا لازمی جزو تھا۔ اب تک کے متعدد ایشوز پر تاریخ ان کی رائے کے حق میں کروٹ لی چکی ہے۔ ہماری ماضی قریب کی تاریخ کے بہت سے قومی و بین الاقوامی ایشوز پر حضرت رائے پوریؒ کا زاویۂ نظر ملک کے باشعور حلقوں میں اپنی اِصابتِ رائے کے باعث خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے۔ ان کا دینی و سیاسی شعور محض وقتی و ہنگامی حالات کے تابع نہیں تھا، بلکہ انسانی، آفاقی اور سدا بہار تھا۔ ہمارے ملک کے نوجوانوں کی ایک بڑی اجتماعیت کی تربیت و ذہن سازی ان کے دانشورانہ اَفکار و خیالات کی رہینِ منت ہے۔ وہ ان کے افکار کو اپنے لیے مشعلِ راہ سمجھتی ہے۔

آج کل ایک بار پھر قومی و بین الاقوامی سطح پر میڈیا میں عرب اسرائیل مسئلہ زیرِ بحث ہے۔ ہم نے حضرت رائے پوریؒ کے وصال کی نسبت سے اس مسئلے کی نوعیت کو ان کے طرزِ فکر کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے طرزِ فکر کا کمال یہ تھا کہ وہ ایشوز کو جذبات کے بجائے زمینی حقائق کے تناظر میں دیکھتے تھے۔ بدقسمتی سے آج بھی اس مسئلے کو اپنے درست تناظر میں نہ دیکھنے اور سمجھنے کی وجہ سے ہمارے ہاں جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں، ان کی وَجہ سے دین، سیاست، امن اور فکر و نظر کے بہت سے تقاضے مجروح ہو رہے ہیں۔

ہمارے ہاں جب بھی اسرائیل، عرب اور فلسطین زیرِ بحث آتے ہیں تو عام طور پر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہ فلسطین کے عرب مسلمانوں اور اسرائیل کے یہودیوں کے درمیان کوئی مذہبی جھگڑا ہے۔ یعنی دو مذاہب؛ اسلام اور یہودیت کا کوئی تنازعہ ہے، جس کی وَجہ سے لوگ اپنے پہلے سے قائم شدہ تصورات کے حوالے سے عالَمِ کفر اور عالَمِ اسلام کی قائم شدہ نفسیاتی پناہ گاہوں کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، حال آں کہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں بہت سے مقامات پر یہودیوں کو عیسائیوں کے ظلم و جبر سے بچایا۔ اس سلسلے میں ہسپانیہ ایک خصوصی مثال ہے، جہاں مسلمانوں نے انھیں ظلم سے نجات دلا کر کئی سو سال تک اپنے نظامِ عدل تلے ترقی و خوش حالی کے مواقع بہم پہنچائے۔

حضرت شاہ سعید احمد رائے پوریؒ اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ: ''یہ دو مذہبوں کی لڑائی نہیں ہے، بلکہ یہ برطانیہ کی استعماری پالیسی کا ایک شاخسانہ ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ یہ اسرائیلی ریاست عرب دنیا کے سینے میں ایک استعماری خنجر ہے۔'' ان کی گفتگو کا پسِ منظر یہ ہوتا تھا کہ دنیا بھر سے فلسطین میں یہودیوں کے ایک خاص جارحانہ فرقے کو عالمی قوتوں کے ایما پر اکٹھا کیا گیا ہے، جسے عربوں پر مسلط کر کے ان کی آزادیوں کو سلب کرنے کا منصوبہ ہے۔ ہماری مخالفت کی وجہ صہیونیت کے سامراجی، نسل پرستانہ اور توسیع پسندانہ عزائم ہیں۔ اس ملک کے قیام کے پیچھے چھپے صہیونیت اور سامراجیت کے درمیان قائم رشتے کو سمجھنا سب سے اہم ہے۔

اسرائیلی یہودی ضرور ہیں، لیکن وہ یہودیوں کا ایک خاص جارحانہ فرقہ ہے، جس کو مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں، بلکہ اس کا اصل مطمحِ نظر اس کے توسیع پسندانہ عزائم ہیں۔ فلسطین میں صہیونی ریاست کے قیام کے لیے بہت سی سرگرم صہیونی تنظیمیں اور افراد تشدد اور دہشت گردی کو بھی سرِعام روا رکھتے رہے ہیں۔ بہت سے پبلک مقامات پر وہ تشدد پسند کارروائیاں بھی کرتے رہے ہیں۔ اسرائیلی ریاست کے قیام کی بنیاد صہیونیت ہے، جو کہ یہودیت سے مختلف ہے۔ ہمیں آج بھی دنیا میں اس کی مثال ملتی ہے کہ بہت سے روایت پسند یہودی علما اسرائیل کے قیام کو درست نہیں سمجھتے۔ صہیونیت کے مبلغ یہودی مذہب کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور دنیا میں مذہبی شدت پسندی کا ایک ماڈل ان صہیونی یہودیوں کے ہاں پایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں جب تک قومی سیاسی سوچ کا فکر غالب رہا ہے تو ایسے ایشو پر تمام قومی سوچ کے حامل دانشوروں کا مؤقف یکساں رہا ہے۔ آپ دیکھ لیجیے کہ اس مسئلے پر اس خطے کے تمام انصاف پسند دانشور، خواہ وہ جس بھی مذہب یا پارٹی سے تعلق رکھتے تھے، وہ عربوں کی قومی تحریک کو سپورٹ کرتے رہے۔ بلاشبہ فلسطین کی قومی آزادی کی تحریک میں مقامی (عرب) مسیحی اور یہودی، مغرب کی قائم کردہ صہیونی ریاست کے خلاف مقامی مسلمانوں کے شانہ بہ شانہ رہے ہیں اور کئی مواقع پر بین الاقوامی سطح کی سرفروشانہ کارروائیوں میں بھی شریک رہے ہیں۔

حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ اس مسئلے کو عربوں کی قومی تحریکاتِ آزادی اور عالمی قوتوں کی سازشوں کے تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی دعوت دیتے تھے۔ وہ اسی قومی طرزِ فکر کے تحت برعظیم ہند و پاک میں موجود سیاسی نوعیّتوں کو حل کرنا چاہتے تھے۔ حضرت رائے پوریؒ کے طرزِ فکر کا یہ قومی اور انسانی پہلو آج پاکستان کو بہت سے درپیش مسائل میں ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ ہم کس طرح انسانیت کی مشترکہ اساس امن، عدل اور مساوات کو بنیاد بنا کر اپنے ملک کی ترقی کے راستے کو ہموار کر سکتے ہیں۔ (مدیر)

www.rahimia.org

انسانی کامیابی اور ترقی کے چار بنیادی اَخلاق 2

مترجم: مفتی عبدالخالق آزادرائے پوری

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''حُجّةُ اللّٰهِ البالِغه'' میں فرماتے ہیں:

دوسرا بنیادی خُلق؛ اِخبات للہ تعالیٰ

''ان اَخلاق میں سے دوسرا اُخلق اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنا اور خشوع اختیار کرنا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ جس انسان کی فطرت سلامت ہو اور وہ تمام کاموں سے فارغ ہوکر اللہ تعالیٰ کی نشانیوں اور اُس کی صفات کی طرف متوجہ ہو اور ان میں خوب اچھی طرح دھیان دے تو اُس کے نفسِ ناطقہ (روح) میں ان آیاتِ الٰہی اور صفاتِ خداوندی کی طرف جھکاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے حواس اور جسم میں اللہ تعالیٰ کے سامنے عجز وانکساری پیدا ہوتی ہے۔ اس کی روح اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک کر تھکی ماندی ہوجاتی ہے۔ اس کے دل میں ذاتِ باری تعالیٰ کی مقدس جناب کی طرف میلان پیدا ہوجاتا ہے۔ اس کی حالت ایسی ہوجاتی ہے، جیسا کہ حکمرانوں کے سامنے ایک عام آدمی پر عجز کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ وہ اپنے دل میں انتہائی عجز وانکساری ملاحظہ کرتے ہیں اور کسی چیز کو دینے یا نہ دینے میں اُس کی طاقت اور قوت کو تسلیم کرتے ہیں۔

انسان کی قوتِ نسمہ (روحِ حیوانی) کی یہ حالت ملاءِ اعلیٰ کے فرشتوں کی حالت کے زیادہ مشابہ اور قریب تر ہوتی ہے۔ فرشتوں کا حال یہ ہے کہ وہ باری تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور اس کے جاہ وجلال کو پوری طرح تسلیم کیے رہتے ہیں۔ وہ اس کی تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتے ہیں۔ انسان میں اخبات کی اس حالت کا پیدا ہونا اس میں کمالِ علمی کی استعداد پیدا کرتا ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ایسی حالت میں انسانی ذہن کی تختی پر معرفتِ الٰہیہ نقش ہوکر رہ جاتی ہے اور اُسے کسی نہ کسی پہلو سے حضرتِ الٰہیہ میں حضوری کی ایسی کیفیت حاصل ہوتی ہے، جس کے بیان کرنے سے قلم عاجز ہے۔

تیسرا بنیادی خُلق؛ سماحت

تیسرا بنیادی خُلق سماحت ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسانی نفس ایسا ہوجائے کہ وہ قوتِ بہیمیہ کے تقاضوں کا فرماں بردار نہ بنے اور نہ ہی اُس میں حیوانی عادات کے نقوش پختہ ہوں اور نہ ہی حیوانیت سے متعلق کاموں کا اثر اور رنگ پایا جاتا ہو۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسانی نفس جب اپنے معاشی اُمور میں مصروف ہوتا ہے، اُسے عورتوں کی خواہش ہوتی ہے، لذات حاصل کرنے کا تقاضا پیدا ہوتا ہے، یا کھانے پینے کا تقاضا پیدا ہوتا ہے تو وہ اُس کے حصول کے لیے کوشش کرکے اپنا تقاضا پورا کرلیتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کی مطلوبہ ضرورت پوری ہوجاتی ہے۔ اسی طرح جب انسانی نفس غضب ناک ہو، یا کسی چیز کی محبت میں مبتلا ہو تو لازمی سی بات ہے کہ اُسے ایک وقت کے لیے اس کیفیت اور حالت میں مشغولیت ہوتی ہے۔ ایسے وقت میں اُس کی نظر اپنے کھانے پینے کی ان لذات کے تقاضوں سے ہٹ کر کسی اور طرف نہیں ہوتی۔

پھر جب انسان اپنے اس نفسانی تقاضے کو پورا کرلیتا ہے اور اُس کی یہ حالت دور ہوجاتی ہے (مثلاً بھوک لگی تھی، کھانا کھالیا تو اُس کی بھوک دور ہوگئی)۔ اس کے بعد:

(الف: سمیح انسان) اگر یہ انسان سماحت کے خُلق کا حامل ہے تو وہ اپنے نفس کے تقاضوں سے اس طرح فارغ ہوجاتا ہے کہ گویا وہ کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔

سماحتِ نفس کے حامل ایسے انسان کی روح جب جسم سے جدا ہوگی اور وہ تہہ بہ تہہ ظلمانی دنیاوی تعلقات سے آزاد ہوجائے گی اور اپنی اصل کی طرف رجوع کرے گی تو اپنی مَلَکیت کے مخالف دنیا سے متعلق کسی چیز اور تعلق کو اپنے اندر نہیں پائے گی۔ اس طرح اُسے یہاں دنیا سے جانے کے بعد اُنس وسرور حاصل ہوگا اور وہ بہت عمدہ اور ہمیشہ رہنے والے عیش میں رہے گی۔

(ب: شحیح انسان) اگر وہ سماحت کے خُلق کا حامل نہیں ہے تو نفسانی تقاضوں کے پورا ہونے کے بعد بھی وہ اُن لذتوں اور کیفیتوں میں اُلجھا رہے گا۔ اس کی وہ نفسانی لذت اُس کے نفس میں ایسے منقش ہوکر رہ جائے گی، جیسے نقش کا کوئی سانچہ کسی موم پر منقش ہوجاتا ہے (ایسا انسان مثلاً کھانا کھانے کے بعد اُس کی لذت اور چاہت میں ایسے مشغول ہوجاتا ہے کہ وہ دل پر نقش ہوکر رہ جائے)۔ جس انسان کی روح پر دنیاوی لذات اور تعیُّشات کے نقش موجود ہوں گے اور وہ ''شحیحة النّفس'' (خُلقِ سماحت سے خالی بخیل روح) ہوگا تو وہ تمام بداَخلاقی کے نقوش مرنے کے بعد اُس کے سامنے آئیں گے۔

(ان دونوں رویوں کو اس طرح سمجھئے!) یہ ایسا ہی ہے، جیسا کہ تم اپنے گرد وپیش میں بعض لوگوں کو دیکھتے ہو کہ ان کا عمدہ مال چرالیا گیا ہو تو اگر وہ شخص سخی دل ہوتا ہے تو اُسے اس چوری کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ اور اگر وہ شخص کمزور نفس ہوتا ہے تو وہ اپنے عمدہ مال کے چوری ہونے پر ایک طرح سے مجنون اور پاگل ہوجاتا ہے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے ہر وقت وہ مال رہتا ہے۔

خُلقِ سماحت اور اُس سے متضاد رویے

اشیا اور چیزوں کی نسبت سے خُلقِ سماحت اور اُس کے مخالف بداَخلاقیوں کے بہت سے نام اور القابات ہیں:

1۔ مال سے متعلق اَخلاق میں خُلقِ سماحت کا نام ''سخاوت'' ہے اور اس کی ضد ''بخل'' ہے۔

2۔ جنسی شہوت کے داعیے سے متعلق خُلقِ سماحت کا نام ''عفت'' (پاک دامنی) ہے اور اس کی ضد ''شرّہ'' (جنسی خواہشات کو پورا کرنے کی عادت) ہے۔

3۔ رفاہیت کے حصول کا داعیہ اور مشقتوں سے نبرد آزما ہونے کے حوالے سے خلقِ سماحت کا نام ''صبر'' ہے اور اس کی ضد ''بے صبراپن'' ہے۔

4۔ شریعت کے ممنوعہ گناہوں کے داعیہ کے حوالے سے خُلقِ سماحت کا نام ''تقویٰ'' ہے اور اس کی ضد ''فسق وفجور'' ہے۔

جب کسی انسان میں سماحت کا خُلق پختہ ہوجائے تو اُس کا نفس دنیاوی شہوات سے بالکل خالی ہوجاتا ہے اور وہ بلند روحانی لذات کی استعداد حاصل کرلیتا ہے۔ الغرض! سماحت انسان کی ایسی حالت ہے، جو علمی اور عملی طور پر مطلوب کمالات کے مخالف بداَخلاقیوں سے باز رہنے اور رُکنے کی استعداد پیدا کرتی ہے۔''

(باب الاصول الّتی یرجع إلیها تحصیل الطّریقة الثّانیة)

www.rahimia.org

تاریخ اسلام کے ناقابلِ فراموش واقعات

مفتی محمد اشرف عاطف، لاہور

دورِ بنواُمیہ میں دینی و دُنیوی علوم کی ترقی و ترویج

عہدِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ کی طرح اُموی دورِ خلافت میں بھی مسلمان عبادات کے پابند تھے۔ مذہبی شعائر سے کوئی بھی بے اِلتفاتی نہیں کرتا تھا۔ شہر، قصبے، گاؤں وغیرہ میں مساجد تھیں، جہاں پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کی جاتی تھی۔

دورِ بنواُمیہ میں حدیث وفقہ، شعروادب کے علمی حلقے منعقد ہوتے، جہاں علمی اشتیاق رکھنے والے حضرات اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے جوق در جوق شریک ہوتے۔ اُموی دور میں شام، عراق اور حجاز اسلامی فقہ کے اہم مراکز تھے۔ شام اور عراق ان دونوں جگہوں سے مشرقی عالمِ اسلام خصوصاً ہندوستان کا انتظامی تعلق تھا۔ اس لیے یہاں شام و عراق کے فقہی مسلک کو ان ملکوں میں قبولِ عام حاصل ہوا۔ عراق (کوفہ) میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگردوں کے سلسلے میں حضرت ابراہیم نخعیؒ (۹۶ھ)، حماد بن سلیمانؒ (۱۱۰ھ)، امام ابوحنیفہؒ (۱۵۰ھ) وغیرہم حضرات کتاب وسنت کی روشنی میں احکام مرتب کر رہے تھے اور شام میں امام مکحولؒ (۱۱۳ھ)، امام ابن شہاب زہریؒ (۱۲۴ھ) اور امام اوزاعیؒ (۱۵۹ھ) اپنے اپنے انداز سے حدیث وفقہ کی تعلیم وتدریس میں مشغول تھے۔ حجاز میں فقہائے سبعہ اور ان کے شاگرد و منتسبین اسلامی فقہ کی تشریح وتدوین کی خدمت سرانجام دے رہے تھے۔ ان علما کو حکومتِ وقت کی مکمل سرپرستی حاصل تھی۔

لسانی وادبی علوم کے حوالے سے بھی بنواُمیہ کا دور مثالی تھا۔ خود اُموی خلفا و اُمرا عربی روایات کے حامل تھے۔ زبان وادب کا پورا پورا لحاظ کرتے۔ ولید بن عبدالملک کی عربیت پر دسترس قدرے کمزور تھی تو اُس کے والد عبدالملک بن مروان نے سرزنش کرتے ہوئے اُسے کہا: ”انّہٗ لا یلی العرب إلّا من یحسن کلامھم“ (وہی شخص عربوں کا والی وامیر ہوسکتا ہے، جو حسنِ کلام رکھتا ہو)۔ (فہرست ابن الندیم، ص318)۔ اس سلسلے میں محمد بن قاسمؒ کا ایک دلچسپ واقعہ بھی علمائے تاریخ نے لکھا ہے کہ راجہ داہر کے ساتھ جب جنگ ہوئی تو کعب بن مخارق اس جنگ میں محمد بن قاسمؒ کے ساتھ تھے۔ انھوں نے حجاج بن یوسف کو جنگ کی ہولنا کی کا نقشہ کھینچتے ہوئے بتلایا کہ جب گھمسان کا رَن پڑا اور تلواریں اور نیزے ایک دوسرے پر ٹوٹنے لگے تو محمد بن قاسمؒ نے اپنے ایک ساتھی سے پانی طلب کرتے ہوئے کہا: ”أَطْعِمْنِی المَاءَ“ یعنی گھبراہٹ کی وجہ سے ”أَسْقِنِیْ“ (مجھے پلایئے) کے بجائے اُن کی زبان سے ”أَطْعِمْنِی“ (مجھے کھلایئے) نکل گیا۔ تو حجاج نے کہا (حجاج کی زبان پر دسترس ومہارت ملاحظہ فرمایئے): یہ جملہ عربیت کے لحاظ سے غلط نہیں۔ قرآن مجید میں ہے: ”اِنَّ اللّٰہَ مُبْتَلِیْکُمْ بِنَھَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْہُ فَلَیْسَ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْہُ فَاِنَّہٗ مِنِّیْٓ (249:2) یعنی اللہ تمھیں ایک نہر کے ذریعے آزمانے والا ہے۔ جو شخص اس سے پانی پیئے گا، وہ میری جماعت سے نہیں اور جو پانی نہیں پیئے گا، وہ میری جماعت سے ہے۔ قرآن مجید میں بھی ”وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْہُ“ استعمال ہوا ہے۔ گویا ”أَسْقِنِیْ“ کی جگہ ”أَطْعِمْنِی“ کہنا درست ہے۔ اُموی دورِ خلافت میں حدیث وفقہ کے علوم کے ماہرین کے ساتھ ساتھ ادبی علوم کے بڑے بڑے علما وفضلا موجود تھے۔

ملکی معیشت

محمد کاشف شریف، راولپنڈی

معاشی خودمختاری کی حقیقت

چین اور امریکا کے درمیان تجارتی مخاصمت ہر گزرتے دن کے ساتھ شدت اختیار کرتی جارہی ہے۔ کرونا وائرس سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کے بعد امریکا کی عالمی مالیاتی نظام پر گرفت کے ڈھیلے پڑنے کے شواہد سامنے آرہے ہیں۔ صرف روس اور چین کے درمیان ڈالر کی جگہ مقامی کرنسیوں میں تجارت کا حجم بڑھ کر 50 فی صد ہو چکا ہے، جو 2016ء میں 19 فی فیصد تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ چین کے دیگر ممالک سے مقامی کرنسیوں کی بنیاد پر تجارتی روابط دراصل ڈالر اور اس سے متعلق عالمی مالیاتی اداروں کی اجارہ داری کو کھلا چیلنج ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی پاکستان اور چین کے مابین مقامی کرنسیوں میں تجارت کا معاہدہ بھی ہے اور دو ارب ڈالر تک کی پاکستانی مصنوعات کی چین درآمد پر ڈیوٹیاں کم یا معاف کردی گئی ہیں۔ CPEC کو کون نہیں جانتا، جس کے تحت 46 ارب ڈالر پاکستان کو قرض کی صورت میں ملیں گے۔ ایران کی معیشت کو سہارا دینے کے لیے 400 ارب ڈالر کا معاہدہ، بنگلا دیش سے 97 فی صد تجارت پر درآمدی ڈیوٹیوں کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں، جن کی بنیاد پر یہ اندازہ لگانا آسان ہوجاتا ہے کہ چین کا اقدام اور نصب العین دراصل دنیا کو ایک متبادل قوت سے روشناس کرانا ہے۔ یقیناً اس مقصد کا حصول اتنا آسان نہیں اور یہ صرف معاشی میدان میں برتری سے ممکن نہیں۔

چناں چہ وہ خطے جہاں چین بہ تدریج اپنا اثر ورسوخ بڑھا رہا ہے، وہاں دیگر عالمی طاقتیں علاقائی جتھے بندیوں کو نئی شکل دے رہی ہیں۔ کہا جارہا ہے کہ پاکستان کو اب چین اور امریکا کے درمیان کسی ایک کے بلاک میں جانا ہوگا۔ یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں۔ پاکستان ایک طویل عرصے تک برطانوی اور امریکی اثر کے تحت خطّے میں کردار ادا کرتا رہا ہے۔ اسی تناظر میں ہمیں معاشی فائدے دیے گئے۔ ہماری فوجی اور سول بیوروکریسی کی تربیت اُسی اثر کے مطابق پروان چڑھی۔ امداد ہو، تجارت ہو، یا سرمایہ کاری، سب مَدّات میں ہم نے اپنے مغربی آقاؤں کو اپنے ساتھ پایا اور اس غلامی میں مزید سہولت کے لیے ہمارے آقا کے عظیم غلام سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات ہماری ہر قسم کی معاونت کے لیے موجود رہے۔ اب اچانک یہ کہنا کہ پاکستان اپنا بلاک بدل رہا ہے، کچھ قبل از وقت لگ رہا ہے۔ یاد رہے پاکستان کے کُل بیرونی قرض کا 80 فی صد ہمارے مغربی اور وسط ایشیائی محسنوں (؟!) کے مرہونِ منت ہے۔ اب چین پاکستان کو اپنے بلاک میں لانے کے لیے یہ سارا قرض تو ادا نہیں کرے گا۔ اس وقت پاکستان کی حالت کچھ یوں ہے، جیسے کسی بچے کے ماں باپ میلے میں کھو گئے ہوں اور دیکھنے والے یہ کہیں کہ یہ اپنا راستہ خود ڈھونڈ لے گا۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ امید ہے آقا پھر سے ہاتھ تھام لیں گے۔

(بقیہ: صفحہ 7 پر)

عالمی منظر نامہ

مرزا محمد رمضان، راولپنڈی

بدلتا ہوا عالمی سیاسی منظر نامہ

شمالی اوقیانوس سے بحرالکاہل کی طرف

4/ اپریل 1949ء کو امریکا کے دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی (ڈسٹرکٹ آف کولمبیا) میں ایک معاہدہ وجود میں آیا۔ اس معاہدے کا نام فرانسیسی زبان میں رکھا گیا، جسے انگریزی میں NATO کہا جانے لگا۔ اس کا صدر دفتر بیلجیئم کے دارالحکومت برسلز میں قائم کیا گیا۔ اس معاہدے میں شریک ابتدائی ممالک پرتگال، اٹلی، نیدرلینڈ، لکسمبرگ، فرانس، برطانیہ اور امریکا وغیرہ تھے۔ 1954ء میں سوویت یونین نے تجویز دی کہ وہ یورپ میں قیامِ امن کے لیے نیٹو میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ تاہم نیٹو کے رُکن ممالک نے اس نظریے کی سختی سے مخالفت کی۔ اس کے بعد 14/ مئی 1955ء کو سوویت یونین نے اپنے اتحادی ممالک کے ساتھ مل کر ایک علاحدہ معاہدہ تشکیل دیا، جسے ''وارسا پیکٹ'' (Warsaw Pact) کا نام دیا گیا۔ پولینڈ کے دارالحکومت وارسا میں معاہدے پر دستخط ہوئے، جسے ''معاہدۂ دوستی، تعاون اور باہمی اعانت'' کا نام دیا گیا۔

انسانی سماج کی ہیئت کو تبدیل کرنے میں ٹیکنالوجی بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ یہی سائنسی ترقیات انسانی زندگی کو جدت کا لبادہ پہناتی ہیں۔ یہی سائنس اب ایک اور صنعتی انقلاب کا روپ دھارتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ جہاں مشین انسانی دماغ کے برابر استعداد کے ساتھ اقوامِ عالم کی ترقی میں معاون بنتی جا رہی ہے، مادے میں پنہاں اصولوں کی جانکاری کا علم رکھنے والے سائنس دان اور معاشرتی و سماجی علوم کے اصولوں سے آگاہ ماہرین کا کہنا ہے کہ دنیا اب چوتھے صنعتی انقلاب کے دور میں داخل ہو چکی ہے، جس میں انسانی دماغ کی صلاحیت کے برابر مصنوعی ذہانت رکھنے والے روبوٹس اور ان جیسی مشینیں زندگی کو مزید بدل کر رکھ دیں گی۔

ذرا ماضی پر نظر دوڑائیں! دنیا میں پہلا صنعتی انقلاب 1760ء سے 1820ء کے دورانیے میں آیا، جس میں پیداوار میں اضافہ کرنے کی غرض سے صنعتی شعبے میں مشینوں کو چلانے کے لیے پانی اور اس سے بنائی گئی گیس یعنی بھاپ کو ذریعہ بنایا گیا۔ ٹیکسٹائل کے شعبے میں ہاتھ کے بجائے پانی اور بھاپ کی توانائی سے مشینوں کو چلایا جانے لگا۔ اس کی بدولت دنیا میں بھاپ سے چلنے والے انجن ایجاد ہوئے۔ اس انقلاب سے نہ صرف لوگوں کی زندگیاں مکمل طور پر تبدیل ہو گئیں، بلکہ ان کی آمدنیوں میں بھی بے پناہ اضافہ ہو گیا۔

دوسرا صنعتی انقلاب اس دور کی دو بڑی ایجادات تھیں؛ بجلی اور مواصلات کا نظام۔ بجلی، برقی مواصلات یعنی ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کو یہاں نمایاں مقام حاصل تھا۔ ریلوے کی تعمیر کے ساتھ پیٹرولیم مصنوعات سے صنعتی پیداوار میں حیران کن حد تک اضافہ ہو گیا۔ 1820ء سے شروع ہونے والا یہ عہد پہلی جنگِ عظیم یعنی 1919ء تک جاری و ساری رہا۔

تیسرا صنعتی انقلاب: بیسوی صدی کے آغاز میں دنیا نے تیسرے صنعتی انقلاب کو ایک جدید ٹیکنالوجی کے طور پر دیکھا۔ جب انسان نے کمپیوٹر کا ابتدائی ڈھانچہ بنایا۔ الیکٹرانک ٹیکنالوجی سے برقی ٹیکنالوجی کی طرف قدم بڑھایا۔ اسی عہد میں انٹینا سے چلنے والا ٹیلی ویژن دریافت ہوا۔ اسی دور میں جہاز ایجاد ہوا، جس نے ذرائع نقل و حمل کی مشکلات پر قابو پالیا۔

چوتھا صنعتی انقلاب: 1940ء میں کمپیوٹر کی ایجاد سے اس انقلاب کا آغاز ہوا۔ یہ انقلاب بائیولوجیکل، فزیکل اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کا ایک ملاپ ہے، جس میں آرٹیفیشل انٹیلی جنس یعنی مصنوعی مشینی ذہانت، بغیر ڈرائیور کے چلنے والی خود کار گاڑیاں، جدید ڈرونز، تھری ڈی پرنٹنگ، کوانٹم (قابلِ تقسیم چھوٹا ترین یونٹ) مکینکس، کوانٹم کمپیوٹر، جدید کرنسی اور انٹرنیٹ کے علاوہ بائیوٹیکنالوجی اور نینو (کروڑواں حصہ) ٹیکنالوجی پر مشتمل ڈیوائسز شامل ہیں، جو انسانی کام کو انتہائی کم کر کے ہر شعبے میں مثالی اور حیران کن تبدیلیاں متعارف کروا رہی ہیں۔ سائنسی ایجادات پیدائش دولت کے عمل کو آسان، سستا اور سرعت رفتار بنا دیتی ہیں، جو انسانیت کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ کہلاتی ہیں۔ گزشتہ صدیوں میں ان ایجادات کا اظہار ایسے خطوں میں ہوا، جہاں انھیں مفادِ عامہ کے عمومی استعمال میں لانے کے بجائے محض گروہی اور طبقاتی مفادات کے حصول کا ذریعہ بنایا جاتا رہا۔ استعماری طاقتوں نے انھیں چھوٹے ملکوں کے مادی وسائل کو لوٹنے کے لیے خوف و ہراس پیدا کرنے کا ذریعہ بنائے رکھا۔ طویل عرصے سے وہ اپنی اسی روش سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اپنی ڈگر سے پیچھے ہٹنے کے بجائے، انسانیت کے استحصال کی ترقی کے نام پر نت نئی سازشیں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ نیٹو کا قیام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ جس نے سرد جنگ کے نام پر انسانیت کو سرمایہ پرستی کی آگ میں مبتلا رکھا ہے۔ انھوں نے گزشتہ صدیوں میں دریافت ہونے والی ٹیکنالوجی اور اس کے ثمرات کو گروہی مفادات تک محدود رکھنے والا سماجی ڈھانچہ دنیا پر مسلط رکھا۔

اگرچہ آج دنیا میں چوتھے صنعتی انقلاب کے نام پر وجود میں آنے والی جدید ٹیکنالوجی کی دریافت کے مراکز بھی شمالی اوقیانوس کے کنارے واقع ممالک ہی ہیں، لیکن ان کے ثمرات کو اقوامِ عالم میں فروغ دینے میں بحرالکاہل کے کنارے آباد ممالک پیش پیش دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے وارسا پیکٹ کی جگہ نیا سماجی ڈھانچہ؛ SCO، BRICS، ترقیاتی بینک، ایشین انفراسٹرکچر انویسٹمنٹ بینک کی شکل میں تشکیل دیا ہے۔ چوتھے صنعتی انقلاب کے ثمرات کا عمل آج پیدائشِ دولت کی صورت میں بحرالکاہل کے کنارے پر واقع خطوں کی طرف منتقل ہوتا جا رہا ہے۔ خطے کی طاقتیں جس کے لیے نیا سماجی ڈھانچہ وضع کرنے میں مصروف ہیں۔

بقیہ معاشی خودمختاری کی حقیقت

بلاک کی تبدیلی ممکن ہے، لیکن یہ ایک طویل مدتی عمل ہے، جس میں خصوصاً پالیسی کا تسلسل ضروری ہے، جو ہمارے سیاسی منظر نامے میں کافی مشکل کام ہے۔ فوج کی صورت میں اس تسلسل کا حصول ہر گزرتے دن کے ساتھ محال ہوتا جا رہا ہے۔ تاریخی حقائق ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ کمان کی تبدیلی ممکن ہے، جو اس تسلسل کو متاثر کر دے۔ خودمختاری کے لیے ضروری ہے کہ مستقل تبدیلی کے لیے جماعتی بنیادوں پر جدوجہد کی جائے اور وقت کی ضرورت، یعنی قومی خودمختاری کی پالیسی میں تسلسل لایا جائے۔

www.rahimia.org

خطبات و بیانات

رپورٹ: سیّد نفیس مبارک ہمدانی، لاہور

صحیح علم اور معرفتِ الٰہی

7/ اگست 2020ء کو حضرت اقدس مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلہٗ نے ادارہ رحیمیہ لاہور میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

’’معزز دوستو! مسلمانوں کی کامیابی اس حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل کریں اور اُس کے ساتھ اپنا سچا تعلق قائم کریں۔ انسانیت کی کامیابی اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ اس کائنات کے خالق و مالک ذاتِ باری تعالیٰ کی حکمرانی، اُس کی شہنشاہیت، اُس کے مالک الملک ہونے کی حقیقت کو بالکل گہرائیوں سے تسلیم کرے۔ یقین کامل پیدا کرے اور یہ سمجھے کہ اس کائنات کا ذرہ ذرہ، اس کا عالم گیر نظام، اس کے چلانے، پیدا کرنے اور اس کے بنانے والی ذات صرف اور صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہے۔ کسی دوسری مخلوق کا اس میں براہِ راست کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ کائنات کی تمام چیزیں اسی ذات کے ماتحت ہیں۔ اسی کے مطابق تمام امور سرانجام پاتے ہیں۔ اللہ کی وحدانیت پر یقین رکھنا مسلمان کی اوّلین ضرورت اور تقاضا ہے۔ اللہ پر یقین رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جو اس کائنات میں عالم گیر نظام کے اصول اور ضابطے مقرر کیے ہیں، ان تمام کو مِن وعَن سمجھیں اور انھیں تسلیم کریں۔

یہ کائنات اللہ نے ایک سسٹم کے تحت پیدا کی ہے۔ یہاں کوئی بھی کام بغیر طے شدہ نظام اور طریقۂ کار کے نہیں ہو رہا۔ ہر چیز اپنے طے شدہ طریقۂ کار کے مطابق ہی سرانجام پاتی ہے۔ انسان پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی کہ وہ ان گردوپیش کے قوانین اور ضوابط کو سمجھے، تسلیم کرے اور اس کے مطابق اپنا نظام بنائے۔ کائنات پر غور و فکر اور تدبر کرے، جو اس کے گردوپیش میں موجود تکوینی یا تشریعی نظام ہے، اس کی معرفت حاصل کرے۔

دنیا میں کون سا انسان ہے جو ترقی کا طالب نہ ہو؟ تنزلی اور ذلت، پیچھے رہنا، مغلوبیت کی حالت میں زندگی بسر کرنا، انسانیت کی اصل فطرت کے منافی ہے۔ اس ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس کائنات کو بنانے والے نے اس کے جو بنیادی اساسی اصول وضع کیے ہیں، ان کا علم وشعور حاصل کر کے اس کے مطابق عملی نظام بنایا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بے علمی، جہالت اور لاشعوری کی بنیاد پر کوئی کام کیے جائیں اور سمجھا یہ جائے کہ یہ ترقی یافتہ کام ہیں۔ دنیا بھر کے تمام یہودیوں، عیسائیوں، ہندوؤں، کافروں اور مسلمانوں میں یہ بات طے شدہ ہے کہ علم ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ علم کے بغیر کسی بھی کام میں آدمی ہاتھ ڈالتا ہے تو وہ ضرور خسارہ اٹھاتا ہے۔ علم صحیح اور پرفیکٹ ہو تو نتائج بھی صحیح اور درست آتے ہیں۔ علم ناقص اور ادھورا ہو یا سرے سے علم موجود نہ ہو تو ہر طرح کا عمل خسارے کا باعث بنتا ہے۔ علم سے کورا جاہل آدمی غلط کام کو اچھا سمجھ کر کرتا ہے۔ ایسا انسان اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ میں بہ ظاہر اچھا کام کر رہا ہوں۔ یہی جاہلانہ خوش فہمی بڑی خرابی کی بات ہے۔‘‘

علم کی بنیاد پر فضیلت

حضرت آزاد رائے پوری مدظلہٗ نے مزید فرمایا:

’’خالقِ کائنات نے انسانی ترقی کے جو اصول متعین کیے ہیں، وہ اُسی عالم سے معلوم ہو سکتے ہیں کہ جو اللہ کی طرف سے دنیا میں علم لایا ہو۔ وہ سوائے نبی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ انبیا علیہم السلام دنیا بھر کے تمام علوم کی مرکز اور منبع ذات یعنی اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات اور اس کے طے کردہ قوانین اور ضابطوں کو دنیا میں منتقل کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ انبیاؑ سے اُن کے صحابہ اور تابعین علم حاصل کرتے ہیں اور پھر اُن کے تسلسل سے جو بھی اُس علم کے حصول کی جدوجہد اور کوشش کرے، وہ بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب اس علم کو حاصل کر سکتا ہے۔ اس میں کوئی نسلی فرق اور امتیاز نہیں ہے کہ فلاں خاص نسل کا آدمی ہی یہ علم حاصل کر سکتا ہے، اَور کوئی نہیں۔

ابھی پچھلے دنوں مدینہ منورہ میں مسجدِ نبویؐ میں پچاس سال تک درسِ حدیث دینے والے بہت بڑے عالم ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمٰن الاعظمی کا انتقال ہوا۔ وہ ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ماں باپ نے اُن کا نام بانکے رام رکھا۔ وہ ہندوؤں کی ایسی نسل سے تھے کہ جن کو خود ہندوؤں میں بھی نچلا درجہ دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں توفیق دی، وہ مسلمان ہوئے، ماں باپ اور گھر والوں نے ان پر تشدد کیا تو وہاں سے بھاگ کر حرمین شریفین چلے گئے۔ وہیں علم حاصل کیا اور وہیں دنیا بھر کے علما سے استفادہ کیا۔ انھوں نے ایک یونیک اور منفرد کتاب ’’الجامع الکامل فی الحدیث الصّحیح الشّامل‘‘ لکھی، جو دنیا بھر میں پہلی مرتبہ نبی اکرمؐ کی صحیح احادیث کا ایک کامل مجموعہ بن کر سامنے آئی۔ امام بخاریؒ نے تو خاص شرائط کے تحت أصحّ الصّحیح احادیث جمع کی ہیں، لیکن انھوں نے دنیا کی کوئی ڈیڑھ دو سو حدیث کی بنیادی کتابوں میں جو صحیح اور حسن احادیث بکھری ہوئی تھیں، ان کا ایک مجموعہ 25 جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ کہاں وہ ایک ہندو کے گھر میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان کی کمزور ترین نسلوں سے ان کا تعلق تھا۔ جن کو خود اُن کے اپنے ہم مذہب کوئی اہمیت اور عزت دینے کے لیے تیار نہیں۔ اور کہاں انھوں نے علومِ نبوت حاصل کیے اور احادیث کی وہ خدمت سرانجام دی، جس کی عرصۂ دراز سے اُمتِ مسلمہ کو ضرورت تھی۔

اسلام کوئی نسلی مذہب نہیں ہے، اور نہ کسی خاص زبان اور قوم کا مذہب ہے۔ یہ کل انسانیت کا آفاقی مذہب ہے۔ جو انسان بھی اس کا علم حاصل کر لے، وہ اس کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے۔ علم کے سامنے ہی گردنیں جھکتی ہیں۔ بانکے رام جب تک غیر مسلم ہے تو کوئی اُس کو قریب لگانے کے لیے تیار نہیں ہے اور جب وہ محدث بن کر مسجد نبویؐ میں روضۂ رسولؐ کے قریب درسِ حدیث دے رہے ہیں، تو دنیا بھر کے بڑے بڑے محدثین ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرتے ہیں۔ یہ ہے علم، اس پر کوئی پہرے نہیں ہیں، کوئی قید نہیں ہے۔ اس لیے صحیح گفتگو وہی کرے گا، جو اپنے شعبے کا علم رکھتا ہے۔ دین کی رہنمائی وہی دے سکتا ہے، جسے علومِ نبوت پر عبور حاصل ہو۔‘‘

www.rahimia.org

ٹھوس علم اور درست طریقۂ تعلیم

حضرت آزادرائے پوری مدظلہٗ نے مزید فرمایا:

’’آج سب سے بڑا المیہ ہے کہ ہم انجینئرنگ کے علم کو علم سمجھتے ہیں۔ فزکس اور کیمسٹری کو ایک علم سمجھتے ہیں۔ میڈیکل سائنسز کو ایک علم سمجھا جاتا ہے اور بڑے ذوق شوق سے اس علم کے حصول کی طرف اپنی نوجوان نسل کو متوجہ بھی کرتے ہیں اور پڑھتے پڑھاتے بھی ہیں، لیکن کس قدر افسوس ہے کہ علومِ نبوت کو علم نہیں سمجھا جاتا۔ یہ دورِ زوال کی سب سے بڑی لعنت ہے، جو آج ہم پر مسلط ہے۔ کسی آدمی کو اُردو میں کوئی دو چار دینی مسئلے سمجھ آگئے، یا اسلام کی نماز روزہ کی کوئی عمومی باتیں اُس نے پڑھ لیں، یا کوئی پانچ چھ نمبر بیان کرنے آگئے تو وہ اپنے آپ کو دینی علم کا علامہ سمجھتا ہے۔ اب وہ جو چاہے لوگوں کے سامنے دینِ اسلام کے نام پر گفتگو کرے، ممبرِ رسولؐ پر بیٹھ کر جو مرضی زبان سے نکالے، فرقہ واریت پھیلائے، آگ لگائے، مفادات اٹھائے، شکل و شباہت عالموں کی بنالے، اب اس علامہ صاحب کے خلاف کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔

دوسرا بڑا المیہ یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں، کالجز، ہمارے مدارس، مسجدیں اور ہماری خانقاہیں علم کا محض تعارف کراتی ہیں۔ ٹھوس علم نہیں سکھاتیں۔ جب سے سمسٹر سسٹم آیا ہے، اس نے تو ویسے ہی علم کی صلاحیت اور استعداد ختم کر کے رکھ دی ہے۔ ایک سمسٹر میں بڑی مشکل سے چار مہینے پڑھاتے ہیں۔ اس میں ایک کتاب یا ایک شعبۂ علم سے متعلق ابتدائی تعارف کرایا جاتا ہے۔ ٹھوس علم نہ اُستاد کے پاس ہوتا ہے اور نہ شاگرد کے پاس۔ علم کے تمام پہلوؤں کا بڑا گہرا تعلق پریکٹیکل کے ساتھ ہوتا ہے۔ محض نظریات و افکار رَٹ لینے سے علم حاصل نہیں ہوتا۔ آپ میں وہ علم تب رچے بسے گا کہ جو کچھ پڑھا ہے، اس کا پریکٹیکل بھی کریں۔ اس علم کے استعمال کرنے میں اگر کوئی غلطی ہو تو اُسے اساتذہ اور ماہرین کی صحبت میں سیکھا جائے۔ لیکن یہاں تو استاد بھی کرائے کا ہوتا ہے۔ آدھا پونا گھنٹہ لیکچر دینے کے لیے آتا ہے کہ اس کے پیسے لینے ہیں اور بس۔ طالبِ علموں کو سمجھ میں آئے یا نہ آئے، وہ اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتا۔ استاد سے سوال کرنا تو ہمارے تعلیمی اداروں میں جرم قرار دے دیا گیا ہے۔ استاد کے سامنے بدتمیزی شمار ہوتا ہے کہ آپ سوال کر کے بات سمجھنا چاہتے ہیں۔

الحمدللہ! مجھے اس ملک کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں میں خطاب کرنے کا موقع ملا ہے۔ طلبا اور اساتذہ سے ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ وہاں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کوئی سوال کرسکے۔ یہ تو سکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کا حال ہے۔ مدرسوں میں بھی علما اور مفتیانِ کرام کا تقدس آڑے آتا ہے۔ وہاں تو مذہب کے نام سے تقدس کی ایک اَور چادر بھی چڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ آپ سوال نہیں کرسکتے۔ بھائی! جب سوال نہیں کریں گے تو بات کیسے سمجھ میں آئے گی؟ علم کیسے منتقل ہوگا؟ آج ہماری یونیورسٹیوں، کالجز اور مدارس میں عام طور پر علم نام کی چیز نہیں رہی۔ جہالت کو فروغ دیا جارہا ہے۔ ڈگریاں ہیں، علم نہ دارد۔ یاد رہے کہ جن قوموں کے پاس ٹھوس علم نہیں ہوتا، وہ کبھی ترقی نہیں کرسکتیں۔‘‘

حقیقی علم کے درست نتائج

حضرت آزادرائے پوری مدظلہٗ نے مزید فرمایا:

’’علم اس بات کی مہارت پیدا کرتا ہے کہ انسانی مسئلے کی نوعیت کو سمجھا جائے اور اُس کا ایسا حل تلاش کیا جائے، جس سے انسانیت کے لیے آسانیاں پیدا ہوں۔ قرآن حکیم میں ہے: ’’اللہ تمھارے لیے آسانی پیدا کرنا چاہتا ہے، تمھاری لیے مشکلات کھڑی نہیں کرنا چاہتا۔‘‘ (185:2) علم اور شعور کی بنیاد پر جو حکمرانی قائم ہوتی ہے، اس کا بنیادی تصور اور بیانیہ یہی ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کی مشکلات دور کرے، آسانیاں پیدا کرے۔ رسول اللہ ﷺ دس سال تک مدینہ منورہ کی ریاست کے حکمران رہے تو لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کیں۔ اُن کی مشکلات دور کیں۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہٗ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہٗ دونوں حضرات کو حضورؐ نے اپنی ریاستِ مدینہ کی حکمرانی کے زمانے میں شمالی اور جنوبی یمن دونوں کا حکمران اور گورنر بنا کر بھیجا تو ان سے فرمایا: ’’لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا۔ اُن کو خوش خبریاں سنانا۔ نفرت اور مشکلات مت کھڑی کرنا۔ تنگی میں مت مبتلا کرنا۔‘‘ (صحیح مسلم: 1733)

علم کا مقصد انسانی مشکلات کی گتھیوں کو سلجھانا ہوتا ہے، لیکن ہمارے ہاں معاملہ اُلٹا ہے کہ ہم علم حاصل کرتے ہیں مشکلات کی گتھیوں کو مزید اُلجھانے کے لیے۔ ہمارا بیوروکریٹ علم حاصل کر کے حکومتی منصب پر پہنچتا ہے تو انسانوں کو سہولتیں دینے کے بجائے اُن کے لیے مشکلات کھڑی کرتا ہے۔ رشوت کے لیے فائل دبا کر بیٹھ جاتا ہے۔ مولوی صاحب علم حاصل کرتے ہیں اور وہ دین کو پیچیدہ اور مشکل بنادیتے ہیں۔ فرقہ واریت کے دبیز لبادے میں اتنا اُلجھا دیتے ہیں کہ اصل دین ہے کیا؟ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آتی۔ وہ فرقوں کی بھول بھلیوں میں داخل کر کے مشکلات کھڑی کرتے ہیں۔ آسانیاں پیدا نہیں کرتے۔

یاد رکھیے! جہالت پر مبنی ناقص علم اور جاہلانہ تصورات ہمیشہ مشکلات ہی کھڑی کرتے ہیں۔ وہ کبھی مشکل حل کرنے کی اہلیت نہیں حاصل کر پاتے۔ تجربے کرتے رہتے ہیں۔ پاکستان کی 73 سالہ تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ کتنے سیاسی تجربے کیے گئے۔ پارٹیاں بدلنے کے تجربے کتنے کیے گئے، سیاست اور معیشت کے حوالے سے کتنی پالیسیاں نافذ کرنے کے تجربے کیے گئے۔ ہر ایک تجربہ ایک نئی مشکل کی صورت میں پاکستانیوں کی گردنوں پر مسلط ہوا ہے۔ مسائل حل ہونے کے بجائے مزید اُلجھتے اُلجھتے آج کئی مشکلات کی صورت میں قومی اُلجھاؤ ہمارے سامنے ہیں۔ ان مشکلات سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ علم وشعور جو قوموں کی ترقی کے لیے لازمی ہے، اسے پورے طور پر حاصل کیا جائے اور اس کا سسٹم بنایا جائے۔ اس سسٹم کے راستے کی رکاوٹوں کو توڑا جائے۔ اسی کو امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ’’فَکُّ کُلِّ نِظَام‘‘ کہا ہے کہ فرسودہ، ظالمانہ اور مشکلات پیدا کرنے والے نظام کو جب تک توڑ کر ختم نہ کیا جائے تو نیا نظام استوار نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہوئے صحیح علم وشعور کی شمع جلانا، اس کا نظام قائم کرنے کی فکر کرنا، اس کی جدوجہد اور کوشش کرنا، تعلق مع اللہ کا پہلا، بنیادی اور لازمی تقاضا ہے۔‘‘

www.rahimia.org

عظمت کے مینار

وسیم اعجاز، کراچی

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ

برعظیم پاک و ہند میں ولی اللّٰہی اَفکار کے فروغ میں جن اکابرین نے نمایاں کردار ادا کیا، ان میں ایک اہم نام حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا ہے، جنھوں نے نہ صرف یہ کہ دین اسلام کی تعلیمات کو علمی و عقلی بنیادوں پر واضح فرمایا، بلکہ عملی میدان میں بھی برعظیم کی آزادی کے لیے کردار ادا کیا۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ اسی عظیم ہستی کے پوتے ہیں۔ وہ محرم الحرام ۱۳۱۵ھ/ 1897ء میں دیوبند میں مولانا محمد احمد قاسمیؒ کے ہاں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے حصول کی غرض سے دارالعلوم دیوبند میں داخل کروائے گئے، جہاں سے 1918ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ، مولانا سیّد اصغر حسینؒ، مولانا انور شاہ کاشمیریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ اور ان کے والدِ گرامی مولانا محمد احمدؒ شامل ہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں قیام کے دوران ہی مولاناؒ کو حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ مناسبت پیدا ہوگئی تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ کی توجہ سے ولی اللّٰہی علوم و افکار آپؒ پر واضح ہوئے اور ان میں سوچ و بچار کا آغاز ہوا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے مالٹا تشریف لے جانے کے بعد آپؒ کا دلی تعلق حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ سے محبت کا ہو گیا تھا، جس کا اظہار اُن کے انتقال پر قاری صاحبؒ کے مرثیے کے ان اشعار سے ہوتا ہے ؎

وہ دل جس میں تمنائے لِقا تھی ، ہائے! اب گھر ہے
اَلم کا ، رَنج کا ، اَندوہ کا ، حِرمان کا ، غم کا
فراقِ یار میں مضمر ہے وَصلِ یار کی دولت
مِری آنکھوں میں ہے ہر وقت نقشہ قطبِ عالم کا

حضرت عالی رائے پوریؒ کے وصال کے بعد حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے ساتھ بھی آپؒ کا عقیدت کا تعلق تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے وصال کے بعد ارادت کا تعلق مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ساتھ قائم فرمایا۔

1922ء میں حضرت قاری صاحبؒ کی علمی و انتظامی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے انھیں ادارے کے نائب مہتمم کی ذمہ داری تفویض کی۔ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کی قیادت میں قاری صاحبؒ نے اس ذمہ داری کو بہ خوبی نبھایا۔ 1929ء میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کے وصال کے بعد ادارے کے مہتمم کی ذمہ داریاں بھی ان ہی کے حصے میں آئیں، جنھیں انھوں نے بہ حسن و خوبی سرانجام دیا۔ قاری طیب صاحبؒ کے دورِ انتظام میں ادارے میں انقلابی تبدیلیاں لائی گئیں، جوان کی انتظامی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں، جن میں نمایاں کام اساتذہ کی پنشن کا اجرا، ٹیم ورک کے اصولوں پر شعبہ تنظیم و ترقی کا آغاز، ماہنامہ رسالہ ''دارالعلوم'' کا آغاز، طلبا کے لیے فزیکل ایجوکیشن اور کیلی گرافی کے شعبے کی بنیاد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ قاری طیب قاسمی صاحبؒ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند کے مرکز نے دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کی۔ اس مادرِ علمی کی شہرت کے باعث دور دراز سے لوگ حصولِ تعلیم کے لیے یہاں آتے تھے۔ اس کثیر تعداد کی تعلیم و تربیت اور انتظامات کے لیے انھوں نے ان تھک محنت کی۔ اساتذہ کی تدریسی صلاحیت کو نکھارنے کے لیے ان کی تربیت پر خاص توجہ دی۔

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ 1939ء میں جب ہندوستان واپس تشریف لائے تو حضرت قاری طیب قاسمیؒ نے اِصرار کے ساتھ دارالعلوم دیوبند میں اُن سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی معرکۃ الآرا کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' پڑھانے کی درخواست کی۔ چناں چہ دارالتفسیر دارالعلوم دیوبند میں حضرت سندھیؒ نے یہ کتاب پڑھانا شروع کی، جس میں حضرت قاری صاحبؒ نے بھی امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے سبقاً سبقاً یہ کتاب پڑھی اور ولی اللّٰہی علوم و معارف میں کمال حاصل کیا۔

مذکورہ دور برعظیم کی سیاسی تاریخ کا ہنگامہ خیز دور تھا۔ اس دور میں تحریکِ آزادی اپنے عروج پر تھی۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ کی سربراہی میں دیگر علمائے کرام جمعیت علمائے ہند کے پلیٹ فارم سے اس تحریکِ آزادی میں سرگرم تھے۔ 1942ء میں مولانا مدنیؒ کی گرفتاری کی خبر کے بعد ان کی رہائی کے لیے مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ کی سربراہی میں احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا تو اساتذہ سمیت طلبا نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت قاری صاحبؒ نے جمعیت علمائے ہند میں بھی بڑا سرفروشانہ کردار ادا کیا۔ اسی سلسلے میں اپریل 1944ء میں جمعیت علما صوبہ سندھ کے اجلاس منعقدہ حیدرآباد سندھ میں انھوں نے بڑا جامع خطبہ صدارت ارشاد فرمایا۔ اس موقع پر حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ بھی تشریف فرما تھے۔ انھوں نے حضرت قاری صاحبؒ پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے کھڑے ہوئے کر اعلان فرمایا کہ: ''میں خطبہ صدارت سننے ہی کے لیے شریکِ اجلاس ہوا تھا۔ اب میرا دل ٹھنڈا ہے۔ آپ نے اپنا خاندانی پیغام پہنچا دیا''۔ (خطباتِ حکیم الاسلام، ج:4، ص:268)

1947ء میں تقسیم ہندوستان کے دوران جب فسادات کا سلسلہ شروع ہوا تو اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ مسلمانوں کی اعانت کا بندوبست کیا جائے۔ اس صورتِ حال میں انھوں نے صوبہ بہار کے متاثرین کے لیے مالی اعانت کا بندوبست کروایا۔ اسی دوران پاکستان تشریف لائے، لیکن کچھ عرصے بعد بہ وجوہ دیوبند واپس جانے کو ترجیح دی۔ 1949ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کی مجلس میں رکن کے طور پر قاری طیب صاحبؒ کو منتخب کیا گیا۔ اس طرح انھیں یہ موقع ملا کہ علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان تعاون کا آغاز ہو۔ یہ شیخ الہندؒ کے مشن کا ایک خاص حصہ تھا، جس کے لیے انھیں کام کرنے کا موقع ملا۔ 1972ء میں ہندوستان میں مسلم عائلی قوانین کے تحفظ اور ان کے نفاذ کے لیے ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کا قیام بھی انھیں کی کوششوں ہی کی بدولت ممکن ہوا، جس میں ملک بھر کے تمام طبقہ فکر کے نمائندے موجود تھے۔ قاری صاحبؒ اس بورڈ کے پہلے متفقہ صدر بھی نامزد کیے گئے۔ یہ نامزدگی ان کی علمی قابلیت کا حکومتی سطح پر اعتراف بھی تھا۔

بقیہ صفحہ 11 پر

وسیم اعجاز، کراچی

مشائخ رائے پور کے متوسل حاجی بابو عبدالمجید کا سانحۂ ارتحال

خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور کے خوشہ چیں یوں تو پوری دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں، لیکن آج جن کا تذکرہ کرنا مقصود ہے، انھوں نے باقی بہتوں کی طرح اپنے والدِ گرامی کی جانب سے ملی خانقاہ سے تعلق کی اس میراث کو بھی تادمِ آخر اپنے سینے سے لگائے رکھا۔

راقم کو اپنے ایک کولیگ اور بابو عبدالمجید کے عزیز انجینئر افتخار احمد صاحب کی جانب سے جب یہ پیغام ملا کہ بابو عبدالمجید صاحب کا انتقال ہو گیا ہے تو وہ تمام مجالس نظروں کے سامنے آگئیں، جن میں مرحوم، حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ اور موجودہ مسند نشین حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ کے ساتھ بڑی عقیدت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ جب کبھی بھی حضرت اقدس کراچی کے تربیتی اور خانقاہی دورے پر تشریف لاتے تو موصوف خود آکر حضرت اقدس کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتے تھے۔

ضروری ہے کہ مرحوم کے تذکرے سے قبل ان کے والدِ گرامی کا تعارف بھی کر دیا جائے۔ مرحوم کے والد حاجی بابو جی عبدالعزیزؒ، حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت اور ان کے خاص مسترشدین میں سے تھے۔ وہ محکمہ ریلوے میں ملازمت کے دوران مختلف شہروں میں اسٹیشن ماسٹر رہے۔ اس کے بعد کراچی کی ریلوے ٹکٹ ایجنسیوں کے انچارج بھی رہے۔ انھوں نے حضرت عالی شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ سے متعلق حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی ''مسدسِ مالٹا'' بڑے اہتمام کے ساتھ کتابت اور طبع کروائی۔ B-32 جیل روڈ لاہور پر حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے قیام کے دوران کھانے پینے اور لنگر کے انچارج تھے، جب کہ معاون کے طور پر موجودہ مسند نشین خانقاہ عالیہ رحیمیہ رائے پور حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلہٗ کے والدِ گرامی حضرت راؤ عبدالرؤف خاںؒ (خلیفہ مجاز حضرت رائے پوری رابعؒ) بھی ان کے ساتھ مہمانوں کی خدمت کرتے تھے۔

حضرت رائے پوری ثانیؒ کے بعد حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ سے اسی طرح پورا تعلق رہا۔ سفر و حضر میں ساتھ شریک رہتے تھے۔ کراچی میں سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی میں اقامت پذیر تھے اور بارہا حضرت رائے پوری ثالثؒ کا وہاں قیام ہوا۔ حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ انھیں کے مکان پر حضرتؒ سے بیعت ہوئے۔

حاجی بابو عبدالمجیدؒ 30/ اپریل 1930ء کو انبالہ انڈیا میں پیدا ہوئے۔ بابو جی عبدالعزیزؒ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ 1947ء میں ہجرت کر کے اپنے والد کے ہمراہ پاکستان تشریف لے آئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ ابتدا میں ایک پرائیویٹ شپنگ کمپنی کے ساتھ منسلک رہے۔ کچھ عرصے کے بعد اپنے ایک دیرینہ دوست کے ساتھ مل کر اپنی شپنگ کمپنی قائم کی اور محنت و مشقت سے اسے پروان چڑھایا۔ موصوفؒ ایک سماجی آدمی تھے اور مختلف سماجی سرگرمیوں میں متحرک کردار ادا کرتے رہتے تھے۔ ایک معروف سماجی ادارے لائنز کلب کے ممبر اور ضلعی گورنر بھی تھے۔ خاص طور پر آنکھوں کے ہسپتالوں میں مستحق مریضوں کے لیے ضروری انتظامات میں پیش پیش رہتے تھے۔ ان تمام تر سماجی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ خانقاہ رائے پور کے ساتھ وہ دلی وابستگی رکھتے تھے۔ سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی میں قیام کے دوران جب بھی حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ کراچی تشریف لاتے تو اپنے والدِ گرامی کے ساتھ مل کر مہمانوں کی خدمت کرتے اور ان کے آرام کا خیال رکھتے تھے۔ جب خیابانِ مجاہد ڈیفنس کراچی میں اقامت پذیر ہوئے تو اپنے والد گرامی اور حضرت اقدس رائے پوری ثالثؒ کے نام کی نسبت سے کھڈہ مارکیٹ ڈیفنس میں ''مسجد عبدالعزیز'' کی بنیاد رکھی اور اس کی تعمیر میں خاص دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ حضرات مشائخ رائے پور سے ان کا ہمیشہ بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ جب بھی کراچی تشریف لے جاتے تو ان کی دعوت پر ان کے ہاں ضرور جانا ہوتا۔

سال کے آغاز ہی میں رحیمیہ ڈائری اور کیلنڈر کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ راقم کا جب بھی جان محمد گدارو صاحب کے ہمراہ موصوف سے ملنے جانا ہوا تو مرحوم لازماً حضرت اقدس اور ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ کے دیگر دوستوں کی خیریت دریافت کرتے تھے۔ حضرت اقدس مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلہٗ کا بھی بہت اکرام کرتے تھے۔ اولیاء اللہ اور بزرگوں کی باتیں بڑے انہماک سے سنتے اور خانقاہ کے معمولات جان کر مسرت کا اظہار فرماتے تھے۔

2010ء میں دل کے عارضے میں مبتلا ہوئے اور شوگر کا مرض بھی لاحق ہو گیا تھا۔ زندگی کے آخری دنوں میں سماعت سے محرومی اور ضعف کی شدت نے گھیر لیا۔ کچھ عرصہ صاحبِ فراش رہنے کے بعد یکم/ جون 2020ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ تدفین کراچی ڈیفنس کے فیز 8 کے قبرستان میں ہوئی۔ حضرت اقدس رائے پوری مدظلہٗ، حضرت مفتی سعید الرحمٰن (سرپرست ادارہ رحیمیہ) اور دیگر مرکزی و صوبائی انتظامیہ نے گہرے دُکھ کا اظہار کیا اور مغفرت کی دعا فرمائی۔ مرحوم کی دو صاحبزادیاں ہیں اور دونوں داماد لیاقت علی اور ظفر حلیم صاحبان بھی حضرت اقدس سے محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ بابو عبدالعزیزؒ اور ان کے صاحب زادے بابو عبدالمجیدؒ کے خانقاہ رائے پور کے ساتھ تعلق اور محبت کو قبول فرمائے۔ (آمین یارب العالمین)

بقیہ: عظمت کے مینار مولانا موصوفؒ کا پہلا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ان کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند نے بہت ترقیات حاصل کیں۔ دارالعلوم اساتذہ اور طلبا کے لیے ہر دل عزیز ادارے کے طور پر متعارف ہوا۔ قاری صاحبؒ نے دنیا بھر کے متعدد ممالک کے دورے کیے اور تقسیم ہند کے بعد کئی دفعہ پاکستان بھی آئے۔ ان کی دوسری بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ افکار و نظریات، جن کا تعارف ہمیں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی متعدد کتابوں میں ملتا ہے، ان کو عام فہم انداز میں عوام و خاص کے سامنے پیش فرمایا۔ اپنے عہد میں وہ بلاشبہ ''حکمتِ قاسمیہ'' کے ترجمان اور شارح تھے۔ مولانا طیب قاسمیؒ کے خطبات میں عوام کی اصلاح اور اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے اور اسلام کی

Monthly RAHIMIA Lahore CPL No. 59

تعلیمات کو عقلی بنیادوں پر انتہائی سہل انداز میں پیش کرنے کے موضوعات شامل ہیں۔ مولاناؒ نے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار کو آسان انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ ان کی تحریر، تقریر، تصانیف اور مجالس وغیرہ میں ولی اللّٰہی رنگ کچھ اس انداز سے غالب تھا کہ انھیں سننے اور پڑھنے والا ان سیاسی، معاشی اور سماجی تصورات کو بہت اچھے انداز سے سمجھ لیتا ہے۔

1980ء میں صحت کی کمزوری کے باعث دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کی ذمہ داری نبھانے سے معذرت کر لی تھی، البتہ درس و تدریس میں تادمِ آخر پیش پیش رہے۔ علم و معرفت کے گلشن کے اس مالی نے ۶ر شوال ۱۴۰۳ھ/ 17ر جولائی 1983ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی تدفین قبرستانِ قاسمی دیوبند میں ان کے دادا کے پہلو میں کی گئی۔

منظوم مولانا مفتی فضیل احمد ناصری، دارالعلوم دیوبند (انڈیا)

لاک ڈاؤن کی تباہ کاریاں

اے لاک ڈاؤن! تُو نے سب کو رُلا کے چھوڑا
ہر دل دُکھا کے چھوڑا ، ہر گھر جلا کے چھوڑا

اب گشت ہے نہ چِلّہ ، تشکیل ہے نہ جلسے
ہر مشغلے کو تُو نے گھر سے لگا کے چھوڑا

خالی ہیں خانقاہیں ، ویران سجدہ گاہیں
صوفی ہو یا نمازی ، سب کو سُلا کے چھوڑا

ساقی بھی جاں بہ لب ہے ، ساغر بھی سر نگوں ہے
واں سے بھی تُو نے ظالم ، سب کو اُٹھا کے چھوڑا

مسجد ہو یا مدارس ، سب کے حواس گم ہیں
ہر انجمن کو تُو نے مُفلِس بنا کے چھوڑا

رسمِ مصافحہ بھی مرحوم ہوچکی ہے
انسانیت کا چشمہ تُو نے سُکھا کے چھوڑا

اَوروں کے سر پہ ہر دم تیری عنایتیں ہیں
مُسلِم کو قید خانہ تُو نے دِکھا کے چھوڑا

پھولوں کا رنگ فق ہے ، بلبل پہ ہے اُداسی
تُو نے تو باغ پر بھی بجلی گِرا کے چھوڑا

کہیے جسے کرونا ، دجال کا مشن ہے
اُس پہ نشاں بہ پانی ، سب کو ستا کے چھوڑا

دینی مسائل

اس صفحے پر قارئین کے سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں!

از حضرت مفتی عبدالقدیر شعبۂ دارالافتا ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

سوال میرا پیشہ کاروبار ہے۔ موٹر سائیکل کے پُرزے بیچتا ہوں۔ مارکیٹ میں میری دوکان ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ میں نے دوستوں سے 6 لاکھ روپے کی انویسٹمنٹ لی ہوئی ہے اور ساتھ میری اور میرے بھائی کی انویسٹمنٹ 25 لاکھ روپے ہے۔ جن دوستوں سے میں نے انویسٹمنٹ لی ہے، وہ میرے ساتھ کام نہیں کرتے، بلکہ اپنی نوکری وغیرہ کرتے ہیں۔ ان کے پیسے پر جو بچت ہوتی ہے، اس کا ان کو 40 فی صد دیتا ہوں۔ کیا ایسے کاروبار کرنا شرعاً درست ہے؟ مزید بھی ابھی کچھ دوست میرے کاروبار میں اپنا پیسہ لگانا چاہتے ہیں۔ شرعی حوالے سے رہنمائی درکار ہے۔

سائل: عثمان خرم، فیصل آباد

جواب صورتِ مسئولہ میں مذکور صورت کو شرعی اصطلاح میں مضاربت کہتے ہیں، لیکن اس کے صحیح اور جائز ہونے کی کئی شرائط ہیں:

۱۔ مضاربہ میں سرمایہ اور کاروبار حلال ہو اور معاملے میں کوئی شرطِ فاسد نہ ہو۔

۲۔ سرمایہ کار جو رقم بھی انویسٹ کرے، اس کا حساب کتاب الگ ہو اور ہر چیز (اصل رقم) اور منافع فیصدی اعتبار سے متعین ہونا چاہیے، تاکہ بعد میں کسی قسم کا جھگڑا پیدا نہ ہو۔

۳۔ معاملے میں منافع کی تقسیم حقیقی نفع کے تناسب سے طے کی جانی چاہیے۔ کسی بھی فریق کے لیے کوئی مخصوص اور متعین رقم کی شرط لگانا جائز نہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ آدھا آدھا یا پونا میرا باقی، تیرا۔ یہ درست نہیں ہے۔

۴۔ اگر کاروبار میں سرمائے کا نقصان کم ہو تو اُسے نفع سے منہا کر کے پورا کیا جائے گا، جب کہ مکمل نقصان کی صورت میں سرمایہ کار' سرمائے کا نقصان برداشت کرے گا اور مضارب (محنت کرنے والے) کی محنت رائیگاں جائے گی۔

۵۔ مضارب (کام کرنے والا) امین کی حیثیت سے کام کرے گا۔ لہٰذا اگر رب المال (سرمایہ کار) نے مضاربت کے لیے کسی خاص قسم کے کاروبار کی شرط لگائی ہے تو مضارب صرف اسی نوعیت کا کاروباری کام کرسکتا ہے، ورنہ وہ خیانت ہوگی۔ اسی لیے وہ ربّ المال کے مضاربت میں لگائے ہوئے پیسے کا مکمل حساب رکھے گا۔ جس پر دونوں ربّ المال و مضارب معاملہ مضاربت چیک کر کے دستخط کریں گے اور اس پر گواہ بھی بنائیں گے۔

۶۔ مضارب (محنت کرنے والے) کو صرف حاصل شدہ نفع میں سے ہی حصہ ملے گا۔ اصل سرمائے میں سے کچھ بھی نہیں لے سکتا۔

۷۔ مضاربت میں مدتِ معاملہ معین ہونی چاہیے۔ اس مدت کے بعد یہ معاہدہ باطل ہوجائے گا۔ مزید معاملہ جاری رکھنا ہو تو اسے دوبارہ الگ طے کرنا ہوگا۔ فقط واللہ اعلم

www.rahimia.org

مدیرِ اعلیٰ مفتی عبدالخالق آزاد طابع و ناشر نے اے۔ جے پرنٹرز 28/A نسبت روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہ نامہ "رحیمیہ" رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ لاہور سے جاری کیا۔